

نامو عود

شهرام سردی

Na Mau'ud

By : Shahram Sarmadee

1st Edition : 2014

ISBN

Rs : 150/-

© شائستہ سرمدی

نام و عود	:	شہرام سرمدی
سالِ اشاعت	:	۲۰۱۴
گرد و پیش	:	بہادر زمانی
پشت جلد تصویر	:	علی رضا روز بہ
کمپیوگرانی	:	مرزا وحی بیگ
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۱۵۰ روپے
ناشر	:	دلیز پبلی کیشنز، نئی دہلی

خدا کی مصلحتوں

اور

عشق

کے

نام

فہرست

خاکِ پریشاں (سالم سلیم)

نظمیں

غزلیں

موعود

میں شکرگزار ہوں

سالم سلیم

خاک پریشاں

معاصر شاعری میں ایک آواز اپنی پوری قوت کے ساتھ ہماری سماعتوں میں وارد ہوئی ہے۔ اپنی نستعلیق شخصیت اور تہذیب یافتہ وحشت کے درمیان کھڑے اس آواز کے خالق کا جسم دفتری فائلوں میں کھویا ہوا ہے اور اس کی روح سیر سماوات میں گم ہے۔ اس کے وجود میں تخلیقی بے چینی اور اضطراب کی ایک دبیز پرت جمی ہوئی تھی اور آج ناموعود سامنے ہے تو گویا پہلا پردہ اٹھا دیا گیا ہو۔

جہاں کہیں بھی گیا ساتھ تھا غبارِ حیات

کہاں سے خاکِ پریشاں یہ میں اٹھالایا

شہرام سرمدی کی صورت میں نہ صرف ایک طرح دار شاعر کا اضافہ ہوا ہے بلکہ انھوں نے موضوع ساخت اور جذبے کا ایک منفرد دریچہ وا کیا ہے۔ ان کی شاعری میں وجود، عدم، ازل، ابد اور نفی و اثبات کی پرشور ہوائیں تیزی سے چل رہی ہیں اور ان پر اسرار

خوشبوؤں میں لپٹا ہوا شاعر اپنے دشت وجود کے ایک ایک ذرے کے ساتھ زندگی میں مصروف ہے۔ ان کی شاعری کے یہی ابعاد ہیں اور انھیں انتہاؤں پر جا کر انھوں نے اپنا اظہار کیا ہے۔

شہرام کی بیشتر نظموں میں ایک ایسا شخص ابھر کر سامنے آتا ہے جو اپنے فکریاتی وجود میں کھویا ہوا ہے، اس نے اپنی شرطوں پر نفی و اثبات اور وجود و عدم سے معاہدہ کیا ہے۔ دراصل ان کے یہاں تفکر ایک زندہ تجربے اور تحریک کی شکل میں در آیا ہے۔ یہاں ناکامی اور کامیابی کا سوال نہیں بلکہ جذب کا معاملہ ہے۔ وہ اپنی نظموں کا تار و پود ہمیں سے تیار کرتے ہیں۔ اس فکر میں ایک والہانہ انبساط و سرور کی کیفیت بھی شامل ہو گئی ہے اور اس آمیزش سے ان کے وجود کے اندر برپا ہونے والی شکست و ریخت کی بازگشت نے ان کو ایک آہنگ دے دیا ہے، یعنی ذات کا آہنگ۔ شہرام اس آہنگ میں ڈوبتے ہیں اور تازہ زنجموں کے نشانات تلاش کرتے ہیں۔

’ہو العشق‘، نفی کی حمایت میں، ’منکر حق‘ اور ’تجزیہ‘ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں متکلم کا مخاطب خدا سے ہے۔ بین السطور میں شہرام اپنی آگہی اور وجدان کی اس سطح پر کھڑے ہیں جہاں خدا سے کوئی حجاب نہیں رہ جاتا۔ یہاں تک کہ ذات کی دیوار بھی ہٹ جاتی ہے اس کے بعد صرف اور صرف ’سرمدی‘ بچتا ہے۔ اسی سرمدیت میں جی کر انھوں نے اپنا رنگ پایا ہے۔ ان کی روح نے بھی یہیں ٹھکانا کیا۔ یہاں ان کا وجدان گہرے سانس لے رہا ہے اور غیب سے ایک ’آواز‘ پلٹ پلٹ کر شہرام کا قالب اختیار کرتی ہے۔ یہ آواز ان کے باطن میں اندر تک اتر گئی ہے کیوں کہ ان کا اس آواز سے ہمزادگی کا رشتہ ہے۔

’ناموعود‘ کی تمام تر شاعری کو ایک اکائی کے طور پر دیکھنا مناسب ہوگا۔ ان کے احساس اور وجدان نے اپنا پیغام خود تلاش کر لیا ہے۔ خواہ نظم ہو یا غزل تجربے اور شعور کی کار فرمائی ہر جگہ

موجود ہے۔ اس شاعری میں ملال اور عزونی کا عرصہ پھیلتے پھیلتے اچانک بلند آہنگی سے وصل کرتا ہے۔ غزلوں میں بھی ان کے یہاں فکری کش مکش کی تیز کاٹ موجود ہے۔ وہ اپنی روح پر لفظوں کو صیقل کرتے ہیں اور اپنے خلا کو پُر کرتے ہیں۔ یہ غلامادی وجود سے لے کر ان کی مابعد الطبیعات تک پھیلا ہوا ہے۔

کبھی تلاش کیا تو وہیں ملا ہے مجھے
نفس کی آمد و شد میں جہاں خلا سا ہے

طویل سلسلہٴ مصلحت ہے چار طرف
یقین کر لے مری جاں خدا بھی تک ہے

شہرام کی شاعری میں ایک بہت ہی پراسرار اور ناقابل فہم خوف بھی در آیا ہے۔ یہ خوف کائنات اور اس کے مظاہر کے سلسلے میں بھی ہے اور ان کی ذات کے حوالے سے بھی ہے۔

میں جس سے خوف زدہ تھا شروع سے آخر
تم اساکر گئی یہ کائنات ایسا ہی

اک غروب بے نشان کی سمت رستے پر ہوں میں
خوف یہ درپیش ہوں گی کیسی دنیا میں وہاں

غروب بے نشان کی یہ کشش شہرام کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان کے یہاں وہم، نامعلوم اور ناموجود کے تین ایک دکچپ اور گہری مراجعت نظر آتی ہے۔ سو یہ شاعری بھی انھیں غارزار

جنگلوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ ان کے سفر کا حاصل الحصول وہی آبلہ پائی اور زخم انگیزی ہے جو اس راہ کے دوسرے مسافروں کا مقدور رہا ہے۔ نامو عود اسی سفر کا بیانیہ ہے۔ اس بیانیہ کے اظہار میں انھوں نے اپنی تنہائی کو بھی شریک کر لیا ہے۔ ان کی تنہائی بہت پیچیدہ اور اذیت ناک ہے، اسی لئے وہ شعور و لا شعور کی ہر سطح پر تنہا نظر آتے ہیں مگر اس تنہائی کے پس منظر میں 'عشق'، 'بہر' اور خدا کی مصلحتیں موجود ہیں لہذا اس منزل پر آ کر شہرام کے لئے سوائے خود کلامی کے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ پھر یہ خود کلامی اور تنہائی ایک کیفیت اور نشے میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ان کا یہ مجنونانہ رقص دیکھنے کے لئے زمین و آسمان کے ساتھ خدا بھی آمو جو د ہوتا ہے اور یہیں سے شہرام کی تنہائی ایک بہت بڑے حلقہ نور میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اک انبوہ فساواں
 جوق اندر جوق سب افراد
 'اقدرا' کی طرف جاتے ہوئے
 اور میں اُدھر غارِ حرا کی
 چہل سالہ خامشی میں
 محو ہوتا جا رہا ہوں

سودا زده صورت معنی هستم

حضرت سرمد

نظہیں

نہنی کی حمایت میں

وہ شہر گ سے قریں ہے یا

کہ شہر گ میں کہیں ہے

یہ ابھی تک طے نہیں ہے

اور اگر بالفرض طے ہو بھی گیا تو

وہ مکاں ہوگا

مکیں لیکن کہاں ہوگا

مکاں، صاحب مکاں دو مختلف شے ہیں

مثال پردہ آواز اور نے ہیں

تنفس تیز تر ہو تو
 فتنار روح سے نس نس چٹختی ہے
 تنفس نرم تر ہو تو
 سکوتِ دائمی ہی اصل ہستی ہے

تنفس ہے کہ
 پردہ درمیانِ زندہ و مردہ
 مگر وہ ہستی موجود
 مرگ و زندگی سے ماورا ہے
 ہستی موجود ہی اصل خدا ہے
 اور خدا

ہر شے کی شہ رگ سے قریں
 ہر شے کی شہ رگ میں کہیں
 اور کوئی بھی شے ہے نہیں

نور کی آمد

رنج ہوا ہے
 تکتے تکتے
 اس آواز کا
 رستہ جس سے
 'نور' کی آمد
 وابستہ ہے
 قوس قزح کا
 اک رشتہ ہے

رنگ و نور کی
 سب تعبیریں
 سب تفسیریں
 ایک کہانی
 سب لایعنی

ان لایعنی
 تعبیروں کا
 تفسیروں کا
 اسمِ اعظم
 ’نور‘ کی آمد
 ’نور‘ کی آمد
 وابستہ ہے

اس آواز سے
 جس کا رستہ
 تکتے تکتے
 رنج ہوا ہے
 رنج جو اب تک
 زخم کی صورت
 ہرا ہرا ہے
 کوئی دوا ہے

پتنگ اڑانے سے پہلے

پتنگ اڑانے سے پہلے یہ جان لینا تھا
 کہ اس کی اصل ہے کیا اور ماہیت کیا ہے
 بہت نجف سی دو بانس کی کھینچیں ہیں
 اور ان سے لپٹا مربعے میں ناتواں کاغذ
 یہ جس کے دم پہ ہوا میں کلیلیں بھرتی ہے
 ذرا سی ضرب سے وہ ڈور ٹوٹ جاتی ہے
 پتنگ کٹ گئی تو اس کا اتنا غم کیوں ہے
 پتنگ اڑانے سے پہلے یہ جان لینا تھا
 کہ اس کی اصل ہے کیا اور ماہیت کیا ہے

تمہیں معلوم ہے

تمہیں معلوم ہے میں حافظ شیراز کے اس شعر کو مہمل سمجھتا تھا: 'کہ عشق
آساں نمود اول دے افتاد مشکلہا، مگر کل جب تمہارا خط ملا تو میں لسان الغیب کی معجز بیانی
شعر کی تہہ داریوں کو سوچ کر حیران تھا۔

تمہیں معلوم ہے گل شام جب اللہ میاں سے دیر تک پوچھا کیا میں: 'وہ جو مجھ کو چاہتا
ہے کیا مرا ہوگا نہیں۔' تو میں نے دیکھا غول اندر غول ابا بیل آسماں سے چونچوں اور
پنچوں میں کسکریاں لیے تیزی سے میرے آئیناں کی سمت بڑھتی آرہی تھیں۔

تمہیں معلوم ہے کل رات شیفرڈ روڈ پر، وہ بے ضرر کتا کبھی بھونکا نہیں کرتا تھا، جو
خاموش رہتا تھا۔ ٹرک کے نیچے آکے مر گیا۔ یہ خامشی سنتی ہو تم، اس کی ہی چیخیں ہیں۔

کتاب گمراہ کر ہی ہے

کتاب گمراہ کر ہی ہے
 پہ اک یقیں ہے کہ
 اتنی گمراہیوں کے پیچھے
 کوئی تو اک راہ ہوگی
 جو منزلوں سے نہیں ملے گی
 سفر پہ جو گامزن رکھے گی

سفر میں منزل؟

یہ شرک کہنہ
 سفر کی وحدانیت کو مجروح کر رہا ہے
 کہاں کی منزل؟
 کہاں ہے منزل؟
 یہ شرک کے ہیں سراب سارے
 ہم آپ ہیں محو خواب سارے

یہ شرک ایفون بن کے خوں میں گھلا ہوا ہے
 ہجوم منزل میں اب سفر کی شناخت
 خود ایک مسئلہ ہے
 سفر خلا ہے
 سفر میں جو کچھ بھی ہو نتیجہ وہی خلا ہے

یہی خلا ہے
 خلا کو منزل کے نقش پا سے کثیف کرنے کا
 احمقانہ خیال چھوڑو

کتاب گمراہ کر رہی ہے
سفر پہ نکلو
پہ منزلوں کے مہیب سایوں کی زد سے
خود کو بچائے رکھو

سفر پہ پاؤں جمائے رکھو
یہ سب وجود و عدم کے قصے
سفر میں تخلیق ہو رہے ہیں

ازل نہیں ہے، ابد نہیں ہے
یہ اک سفر ہے کہ حد نہیں ہے
تو کیسے 'ناحد' میں
منزلوں کی حدیں بنائیں
خلا = خلاِ خلائیں

اسی وجودِ خلا میں اناں
وجودِ انسان شرکِ اعظم
یہ ایک نکتہ ہے 'اسمِ اعظم'
کس 'اسمِ اعظم' کی جستجو میں

کتاب تصنیف ہو رہی ہے
کتاب تالیف ہو رہی ہے

وجودِ انساں
کتاب تصنیف کر رہا ہے
کتاب تالیف کر رہا ہے
کتاب گمراہ کر رہی ہے

حلا سا کہیں ہے

خیابانِ دانش گہہ مٹی سے

یہاں راج پتھ کے سفر تک

ہمیشہ مرے زیرِ پا

شاہراہیں ری ہیں

اعلیٰ عمارات

سربز میداں

دورویہ قطاروں میں
 اشجار فرحان
 تمدن کے نماز
 بے مثل نقل و حمل کے ذرائع
 تحفظ کو جاننا
 سرباز ہر گام آنکھیں بچھائے

میں اک بچہ قریہ دور افتادہ
 لیکن
 مرے بخت میں آج تک
 پائے تختی سکونت رہی ہے
 اور اب جس ادارے سے وابستگی ہے
 وہاں عین لازم ہے بیرون کشور
 یوں ہی پائے تختی سکونت ملے
 (یعنی۔۔۔۔۔ محفل میں عربت ملے)

وہ خوش بخت و خوش کام ہوں

زندگی سے شکایت

سراسر غلط، ناروا ہے

وہ برحق ہے، حق جانتا ہے

مگر یہ بھی حق ہے

میں اک ایسا فن پارہ ہوں

جس کے فنکار

اس شہر کے کہنہ گھر میں مکیں ہیں

جہاں واپسی کے مری آج امکاں نہیں ہیں

میں اکثر

یہی سوچتا تھا

سبھی کچھ میسر ہے

پھر کیوں خلا سا کہیں ہے

گھلا، ہجر فنکار سے دل حزیں ہے

بخت برگشتہ

میں ’ظاہر‘ کے سفر پہ گامزن کب تھا
مگر ’باطن‘ کے پیچیدہ عجب کو چوں سے
جب گذرا

ہر اک دورا ہے پر
’ظاہر‘ تعاقب کر رہا تھا
’اقتدار و رتبہ و ثروت‘ سے
میرا دامن بوسیدہ پل پل بھر رہا تھا

ماحصل یوں ہے
 مرے دستِ تہی کو
 وہ میسر ہے
 کہ جس کی دستیابی کے لیے
 دنیا پریشاں اور کوشاں ہے

مگر میں بخت برگشتہ
 سحرِ تاشام سرگرداں
 ابھی تک سوچتا ہوں میں
 کہ یا رگم شدہ
 وہ اندروں میرا کہاں ہے؟

بینائی

تیز دھوپ کی کرنیں
کیوں ہماری پلکوں میں
سوئیاں چبھوتی ہیں

ہم تو ان مناظر کو
اپنی بند آنکھوں سے
دیکھنے کے عادی ہیں

وہ بات

وہ بات اگر میں خدا سے کہتا
میں جاننا ہوں وہ سن بھی لیتا
(جواب دینے کی کوئی معیاد طے نہیں ہو
تو صرف سننے میں حرج کیا ہے)

میں مانتا ہوں
جواب وہ ایک روز دیتا
یہ خواہشوں نے مری سماعت کو معتبر ہی کہاں ہے رکھا
یہ خواہشیں ہیں کہ میرے کانوں میں روئی سا کچھ نہاں ہے رکھا

میں سوچتا ہوں
 وہ بات اگر میں خدا سے کہتا
 تو مصلحت کا شکار ہوتی
 فضول بے اعتبار ہوتی
 میں مصلحت کا نہیں مخالف
 پہ جانتا ہوں کسی بھی شے کے
 ہر ایک پہلو پہ غور ہوگا
 تو مصلحت کا شکار ہوگی
 تلاش ہر اعتبار، بے اعتبار ہوگی

میں چاہتا ہوں
 کہ مشورہ بھی کروں کسی سے
 یہ عقلِ انسان
 (عقلِ ناقص)

ہر ایک پہلو پہ غور
 خود ایک مضحکہ ہے
 یہاں سے آگے جو مرحلہ ہے
 وہ فہمِ انساں سے ماوراء ہے

خیال آتا ہے اکثر اکثر
 خلیفۃ الارض ہوں
 اسی سطح پر جو سلجھاؤں بات کو میں
 مگر خلافت کو کیا ولایت ملی ہوئی ہے
 مزید یہ کیا عوام و اشراف کی حمایت ملی ہوئی ہے
 اگر نہیں تو یہ جزو افکار کس لیے ہے
 یہ فکر یکا کس لیے ہے

وہ بات یوں اہم ہے
 کہ میرے وجود میں رونما ہوئی ہے
 وجود کی اک بنا ہوئی ہے
 وہ بات مجھ سے جدا نہیں ہے
 وہ بات سچ ہے وہ محض اک مرحلہ نہیں ہے
 وہ بات میں ہوں
 میں خود کو ضائع نہیں کروں گا

ایسا بہت ممکن نہیں

ہم نے کبھی سوچا نہیں
اس پار افق کے اس طرف
کیوں دید کے خواہاں ہیں ہم

کیا واقعی ان وادیوں
میں ہوگی ایسی خامشی
ہم آخری نغمے جہاں
بے خوف اور بے چشم نم
اک بار کھل کے گاسکیں

شاید یہ ممکن ہو مگر
ایسا بہت ممکن نہیں

سرگزشت

کچھ خوش نما پرندے
آج اپنے گھونسلوں سے
اک ورطہ ہوس میں
محصور ہو کے نکلے

اور ماحصل سفر کا
پنچوں میں خاکِ صحرا
چونچوں میں سنگِ ریزے
آنکھوں میں فہمِ ناقص
کے ہجویہ قصیدے

فعل استمراری

نرم آنکھیں

گندمی آواز

خوشبوئیں

(بدن کی، زلف کی)

لہرائیں پھر خالی فضا میں

اور ہم گھر میں

جنوں کے قرض ادا کرنے لگے

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا

نیا زمندوں کی بھیڑ ہے اک
 قطار اندر قطار سارے کھڑے ہوئے ہیں
 میں فاصلے پر ہوں، سوچتا ہوں
 کہ دستِ خالی کے اس سفر میں
 کمانا کیا اور گنونا کیا ہے

میں اس مقام عجیب یعنی
 'کمانا کیا اور گنونا کیا ہے'
 پہ جب پہنچتا ہوں، دیکھتا کیا ہوں

میں اسی دائرے کے اوپر کھڑا ہوا ہوں
جہاں میں کل تھا

جو فرق آیا تو صرف اتنا
تب اس طرف تھا
اب اس طرف ہوں

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا
'--- تو زندگی کیا سفر ہے بس اک طرف طرف کا'
کہ آگیا موڑ
اشارہ تھا میرے برطرف کا

خدا سے

میں منہ بھر قہقہے پہ قہقہے
 جویوں لگانے کی مشقت
 از سحر تا شام کرتا ہوں دیانت سے
 تو مسز دوری بھی واجب سی ملے کوئی

بہت دن سے مری آنکھیں
 کبھی بھر بھر نہیں روئیں

یہ زخم

کس زخم سے
اس جسم کو
آراستہ

کرنا ہے اب
ہر زخم کی
کوئی دوا
اس جسم کو
معلوم ہے
مقصود گر

کچھ زخم ہی
دینا ہے تو

اس لمحے کو
 چھو کر گزر
 جس لمحے میں
 یہ روح کچھ
 بھاری ہوئی
 یعنی ہوس
 طاری ہوئی
 اور دائمی
 اک زخم کا
 نظارہ کر
 یہ زخم، زخمِ جاں گسل
 یہ زخم غیر مندمل

پہلے عشق کی موت پر

بجبا

نماز جنازہ ہم نے ادا تو کی تھی
 یہ تجھ کو سجدہ نہیں کیا تھا

تمہارے بعد بھی

تمہارے بعد بھی
میری خدا سے گفتگو ہوتی ہے لیکن
موسموں پر

آیتِ عشق

اورش
 قلبِ عشق
 اسی قلبِ عشق سے
 آغاز میرے نام کا
 اک نعرہ: لا الہ

کل اک درویش کہتا تھا

کل اک درویش کہتا تھا
 'حصارِ چشم سے باہر کے منظر دیکھ سکتے ہو'
 میں اس درویش سے بولا:

اے بابا!
 'حصارِ چشم کے اندر کے منظر دیکھنے کی آرزو ہے'
 وہ فقیر محترم کچھ دیر تک کچھ بھی نہ بولے
 پھر کہا: 'بیٹا!
 تمہاری آنکھ میں بیٹکا گرا ہے
 آؤ میں اس کو نکالوں'

وقت کو بھی سنوار آیا

ہوا مخالف کبھی نہیں تھی
 یہ فکر ہر چند تھی
 مبادا سفر زمیں تک سمٹ نہ جائے
 وہ بانہر تھی
 سفر کے اس سمت جو حضر ہے
 وہی حضر منبع سفر ہے

ہوا کی جانب سے آرہا ہوں
 میں جانتا ہوں
 کہ دارِ شین ہوا کے حق میں
 قیام قطعاً حرام شے ہے
 یہ میرا ہونا مثالِ نے ہے
 جو اک تماشا یہ پل رہا ہے
 مری صدا سے سنبھل رہا ہے

میں جانتا ہوں
 گرے سے باہر
 نظام شمسی کے سنگ میلوں کے
 اس طرف اک نظام ہستی ہے
 نے کی ہستی ہے
 نے کی ہستی ہے اصل ہستی
 'نہیں' کے 'ہے' سے بسی ہے ہستی

وہ ایک لمحہ کہ جب حضر میں سفر ہوا تھا
 کہ سحر مرگ و حیات سے جب مفر ہوا تھا
 تو زندگی کا خیال آیا
 جمال آیا
 جمالِ طرفہ کمال آیا
 کمال آیا تو حال آیا
 جو حال آیا تو وقت کو بھی سنوار آیا
 حضر پہ کیا کیا نکھار آیا

شیفرڈ روڈ سے گذرتے ہوئے

پھر تصویر میں

ہیولا اک ابھرتا ہے

فضا میں پھر رہی ہیں

سرمئی نیلی ہوائیں

پھر کہیں بنتے بگڑتے دودھیا سے کچھ بگولے

ذہن سے آنکھوں میں اترے
 آنکھوں سے
 اس بے کراں منظر میں مکھرے جا رہے ہیں

دور پیا نو پر کوئی
 مدہم سروں میں گارہا ہے
 ”اسے یوں چہرہ چہرہ ڈھونڈتا ہوں
 ”وہ جیسے رات دن سڑکوں پہ ہوگا“ *

* شارق کیفی

تم اپنی سبز آنکھیں بند کر لو

بدلتی رت

مرے ماتھے پہ جو لکھی گئی

وہ سب جانتا ہوں میں

کہ میں نے اپنے والد کی

جوانی کی وہ تصویریں

بہت ہی غور سے دیکھی ہیں

جن میں وہ

کسی کی یاد کی پر چھائیوں کو

اپنی آنکھوں میں چھپائے

آسمان کو تک رہے ہیں

اب وہ آنکھیں میری آنکھیں ہیں

تم اپنی سبز آنکھیں بند کر لو

کیا سچ ہے

میں نے دیکھی ہے اک کتاب ابھی
 جس میں مذکور تم ہو اور میں ہوں
 صفحے صفحے پہ جس میں حاشیے ہیں
 تم سے بس اتنا پوچھنا ہے مجھے
 متن والا مواد کون سا ہے
 اور ان حاشیوں میں کیا سچ ہے

میں واپس آؤں گا

غیر حرائے شاعری میں
 بیٹھنے جاتا ہوں میں
 اور میں حصارِ ذات بھی کر کے رکھوں گا
 اس حصارِ ذات کے باہر
 کوئی بھی داشتہ شہرت کی
 شہرِ نواگ بیٹھے نہ اپنا
 دیکھتے رہنا

نہ کرنا انتظار اس کا
 کہ میں تازہ صحیفہ لانے والا ہوں
 کہ ہر تازہ صحیفہ
 ایک دن منسوخ ہونا ہے
 اسے وہ معنی و مفہوم کھونا ہے
 جو اصل مدعا ہے

میں واپس آؤں گا
 اور میں کتابِ ذاتِ اک ہمراہ لاؤں گا
 'کتابِ ذات' کی ہر آیت
 انسانی مسائل کا بیاں ہوگی
 تلاشِ حل کے ماروں کی
 امیدوں کا زیاں ہوگی

مسائلِ جاوداں ہیں
 ذات کا اصل بیاں ہیں
 اور فسادِ ان سے بلا ہے

اور یہی رمزِ تلاشِ اَلِ خدا ہے
 اور تلاشِ اَلِ خدا آئینہ ہائے زندگی
 اور زندگی غارِ حِسا ہے ذاتِ انساں کی

اسی غارِ حِسا میں جب
 میسر ذات آئے گی
 میں واپس آؤں گا
 اور میں کتابِ ذاتِ اک ہمراہ لاؤں گا
 کوئی بھی داشتہ شہرت کی
 شہرِ نواگ بیٹھے نہ اپنا
 دیکھتے رہنا

ناگفتہ

اس بار ناگفتہ
نہیں لانا مجھے قرطاس پر

ناگفتہ یعنی اک سخن
را ز کہن
سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہوا
قلب و دل ہوتا ہوا

ناگفتہ یعنی اک نظر
جادو اثر کرتی ہوئی
اور باخبر کو بے خبر کرتی ہوئی

ناگفتہ یعنی شمس و مولانا
وہ مولانا کافر مانا:
'کہ بے رنگی اسیر رنگ ہونا
موسوی با عیسوی در جنگ ہونا'

حرفِ ناگفتہ کہ میں ہوں
اور میں
نظارۂ بے رنگی ہر رنگ سے سرشار
اس بار
ناگفتہ کو میں قسطلاس سے آزاد کرتا ہوں
جہاں آباد کرتا ہوں

سر عشقزارے

بیڑن: لام بے پیش لب
 منیڑہ: چپ، ارے بس نہ چپ
 بیڑن: آگے اب تم کہو
 منیڑہ: کیا کہوں۔۔۔ کیا کہوں
 ایسی بکواس کیوں
 جانے بیٹھے ہیں
 اب مرے پاس کیوں
 بیڑن: جاؤں؟
 منیڑہ: ہاں جانے
 بیڑن: پھر نہیں آؤں گا
 منیڑہ: ہاں ہاں مت آنیے
 بیڑن: اچھا اتنا کہو

منیڑہ: کیا کہوں۔۔۔۔۔ بولے

بیڑن: زور سے کہنا پھر

منیڑہ: کیا؟

بیڑن: کہو 'دادا جان'

'دادا' چھوٹا سا اور

'جان' کے درمیاں کا 'الف' کھینچنا

منیڑہ: سیدھے سے کہیے نا

'جان' سننا ہے، ہاں!

بیڑن: تم بھی ناں۔۔۔! اب کہو

منیڑہ: ہاں! جا آں بس

'جان' بس، 'جان' بس

شہر یار کی یاد میں

بیکراں اتنے
 کہ تم پر عرصہ بینائی تنگ
 اور یوں محصور
 ساری فہم و دانش، عقل و نگ
 یا تو کوئی سحر ہو تم
 یا کوئی مشاق سحر
 یا اچھوتا معجزہ ہو

بارہا سوچا ہے
 آخر کون ہو اور کیا ہو تم
 کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا مری
 بس یہ جانا
 تم مکمل آدمی ہو

ایسا ہو کہ نامو عود ہو

وہ غنی ساعت کہ ہم
شاکئی نہ ہوں
یا یوں کہیں خاکی نہ ہوں
صد حیف افلاکی نہ ہوں

کاش اس غنی ساعت میں
اک کارِ غنیمت ایسا ہو
مٹی بدن کی
روح کی تہذیب سے ہموار ہو
بیدار ہو

یہ نقش پائے رفتگاں
 روشن مثالِ کہکشاں
 سب روح کی تہذیب سے بیدار
 مٹی کی نمو ہے
 عکس ہو ہے

روح کی تہذیب
 یا اک سلسلہ جس میں عدم کو ہے ثبات
 (اہلِ زمیں!)
 اک نعرہ دیوانے کی بات
 اور اس عدم سے تا ثبات اک بار
 ایسا ہو کہ ناموعود ہو
 یعنی خدا موجود ہو
 خدا کی فقط خدا کی ہو افلا کی نہ ہو
 اور کوئی بھی شاکہ نہ ہو

هوا لعشق

وہ سارا احمدی کی دف نوازی
اور وہ عشق مولوی

پھر یوں ہوا
وہ تک تک دف
مچھوٹی جباری تھیں
'حق حق حق' میں

یہ فیضانِ نگاہِ شمس تھایا
جذبِ قلب مولوی تھا
بعد ازاں
جو کچھ بھی تھا وہ سرمہ کی تھا

عشق چیزے دیگر است

آج اس کی ڈیوٹی کا یہ پہلا دن تھا
اور اس کے باس کے بنگلے پر
کوئی پارٹی

دیر رات تک گرم رہی
لیکن

اب بھی اس کے جوڑے کی وہ کلیاں
جوں کی توں ہیں

مہک رہی ہیں

جن کو صبح

امانت نے اپنے ہاتھوں سے ٹانگا تھا

ما فوق فطرت

کینوس بینائی کا

بڑھتا گیا۔۔۔۔۔ بڑھتا گیا۔۔۔۔۔ اتنا بڑھا

سرحد بینائی میں

پڑنے لگے گہرے شکاف

اور کینوس پر

ایسی شکلیں رونما ہونے لگیں

جو کل تلک

الف لیلیٰ کے کسی قصے کا

اک ما فوق فطرت جزو تھی تھیں

جب تم مجھ سے ملنے آؤ

تمہاری اپنی دنیا ہے
 تمہارے روز و شب، شام و سحر اپنے
 تم اک آزاد پنجی ہو
 مری جاگیر کا حصہ نہیں ہو تم
 مگر کل شام جب تم مجھ سے ملنے آؤ
 (جیسا تم نے لکھا ہے)
 تو آنکھوں میں
 ذرا کاجل لگا آنا

کل شام

کل شام ٹی وی پر
 بدلتے وقت کے موضوع یہ تم نے
 کہی تھیں جتنی بھی باتیں
 بڑی دلچسپ تھیں وہ اور مدلل بھی

اسی دوران
 اک خواہش ہوئی دل میں
 مری ٹیبل پہ جو تصویر رہتی ہے تمہاری
 اور ٹی وی پر دکھائی دینے والے چہرے کو
 اک بار دیکھوں تو ذرا لیکن
 مری عینک کہیں گم ہو گئی تھی

صفر حاصل کی جستجو میں

گذشتہ یہ سات سال کیسے گزارے میں نے
 (تمام مفروضہ حافظے میں نہیں ہیں
 البتہ جانتا ہوں)
 عجب عجب بہر مصلحت قرض اتارے میں نے
 کہ اصل اپنی گنواچکا ہوں

گذشتہ یہ سات سال
 گویا مہیب سایہ ہو بے نصیبی کا ایسا سایہ
 کہ سات جنموں بھی اس کے قبضے سے
 میں رہائی نہ پاسکوں گا
 (جب اشدوں سے کبھی جدائی نہ پاسکوں گا)

گذشتہ یہ سات سال جیسے قلق ہو کوئی
کہ داد گاہوں کے در پہ محسوس ہو کوئی

عجیب حیرانیوں کا جنگل ہے
اندر اندر بکھر رہا ہوں

(میں کن خلاؤں کو بھر رہا ہوں)

میں اس مقدس کو سوچتا ہوں

جو ایک نانِ جویں تلک

زاد گاہ میں دے نہ پایا مجھ کو

وسیع میدانِ سبز میں تھا

خلیج اندر خلیج پل پل بھٹک رہا ہوں

میں زیرِ پامسرتوں سے اپنی زمین کی راہ تک رہا ہوں

اگرچہ یہ سات سال کا دورِ نرم نہیں تھا

(کہ آنکھوں میں)

وہاں بھی تسلی پکڑنے والا چھک رہا تھا

یہاں بھی اک پھول تھا کہ ہر سو مہک رہا تھا)

مگر وہ آواز _

اب بھی محو کلام

وہ زلف _

لطف و اکرام شام

وہ آنکھیں _

راہ نکلتی ہیں دن ڈھلے سے

بعینہ سات سال پہلے بھی سلسلے تھے

(پگل کہاں نارسائیوں کے یہ مرحلے تھے)

نہ جانے کیوں اکثر

اس خدا کا خیال آتا ہے

جس نے دل میں مرے

تمنا کا بیج بویا

میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں

جو گل جہاں کو

مستاع دنیا قلیل کہہ دے

اور ایک مخلوقِ چند روزہ کی
 اک تمنّا کو مصلحت کے سپرد کر دے
 (ہے مصلحت یا
 کسی سیاست مدار کا سحر گفتگو ہے
 کہ صفر حاصل کی جتجو ہے)

میں سخت حیران و سر بہ زانو
 کہ صفر حاصل کی جتجو میں
 فضول سی ایک آرزو میں
 گذشتہ یہ سات سال اپنے گزارے میں نے
 یہ قرض کیسے تھے
 کس کی خاطر اتارے میں نے

اس کے بعد

اس ویران کھنڈ پر
 لکھی ہوئی ہیں جو تحریریں
 میں ان کو پڑھ سکتا ہوں
 ان کے معنی سمجھ سکتا ہوں
 لیکن اس کے بعد
 کیا کوئی مجھ کو پڑھا کرے گا
 میرے معنی سمجھ سکے گا

جس قدر ممکن ہو

جس قدر ممکن ہو

خود کو

لحہ موجود میں ہم جمع رکھیں

ہم کہ تقسیم زماں سے ماورائیں

روح ہیں، اک عکس لائیں

ہم نہیں تھے، ہم نہیں ہیں
 ہاں زمیں کے اس سفر میں
 گرد و خاک اتنی زیادہ ہے
 نظر میں آگئے ہیں
 اور دھوکا کھا گئے ہیں
 ہم مگر کل بھی نہیں تھے
 ہم کہیں اب بھی نہیں ہیں

اس سفر میں
 ذہن کی نشوونما نے
 اک ہوانے
 رفتہ و آئندہ کو تولید کر ڈالا
 ’نہیں‘ کو منبع تقلید کر ڈالا
 ’نہیں‘ یا ’رفتہ و آئندہ‘ کیا ہیں
 جز سفیرانِ غم و اندوہ
 اک انبوہ

جس میں روح
 کرم ذہن کے ابریشی تاروں میں
 غائب ہو رہی ہے
 رو رہی ہے

روح اپنے ہے سے پھر آواز دیتی ہے:
 'ز میں کی گرد و خاک اس موڑ تک ہے
 اے زیاں کارو! یہ کارِ نفع کرلو
 آؤ خود کو لمحہ موجود میں اب جمع کرلو'

اماوس رات کے مقتول

اس اماوس رات کا

چہرہ بہت کالا تو تھا

لیکن

نہ وہ دندان و ناخن تھے

کہ دیوِ ظلم و استبداد شرمائے

نہ وہ ہیکل
 عظیم البیۃ ووزنی
 نہ وہ لکار تھی
 روئیں کھڑے ہو جائیں
 اور ہم تھر تھرائیں
 اور پسینے چھوٹ جائیں
 پھر بھی اپنے آپ کو
 ہم اس اماؤس رات کا مقتول کہتے ہیں

منکر حق

اک آواز ابھرتی آرہی ہے
 دودھیاسی روشنی اک
 پردۂ بینائی سے ہو کر گذرتی جارہی ہے
 سلب ہوتی جارہی ہے
 قوتِ انکار بھی
 اقرار بھی
 کچھ ہو رہا ہے یا کہوں کچھ ہے
 نہیں معلوم کیا ہے اور کیوں کچھ ہے

اک انبوہِ فراواں
 جوق اندر جوق سب افراد
 'اِقرا' کی طرف جاتے ہوئے
 اور میں اُدھر غائرِ حرا کی
 چہل سالہ خامشی میں
 محو ہوتا جا رہا ہوں

ایک ہے اور اس قدر موجود
 لا موجود بھی ہے اور میں
 اب اس کو خدا میں قید کر کے
 منکرِ حق ہو رہا ہوں
 اندر اندر رو رہا ہوں

اہلِ دل کو بلارہا ہوں

مجھے ودیعت ہوئی ہے
 جب تک تمہاری آنکھیں
 مقامِ بینائی تک نہ پہنچیں
 سفید کاغذ کی روشنی کو
 سیاہ الفاظ سے مسلسل چھپاتے رکھوں

کہا گیا ہے یہ قول بھی دوں
 جب آنکھیں خیرہ نہ ہوں گی
 (یعنی مقامِ بینائی پر پہنچ جائیں گی)
 تو کاغذ سیاہ کرنا میں چھوڑ دوں گا

نئی موعود ہیں یہ الفاظ
 اصل اشباتِ چشمِ بینا
 سفید کاغذ میں پڑھ رہی ہیں
 کہ حرفِ موعود بھی یہی ہے

میں سطحِ کاغذ سے اپنے الفاظ اٹھا رہا ہوں
 اہلِ دل کو بلارہا ہوں

کہے کبیرا

کبیرا رے
 خدا بہرا نہیں
 پھر بھی وہ سادہ لوح
 لکھے کو اگر پڑھتا ہے، پڑھنے دے
 بانگ دینے دے

تراش کوہ بجاہے
 مثل یک آہوا سے
 سب گھاس میں ڈھونڈھا کیے
 کھویا کیے

پل بھر کو اپنا آپ کھو جانا

سحر دم دھند میں لپٹے
گلی کو چوں سے اپنا سر جھکائے
اک زمانے سے کدھر وہ جا رہا ہے
خود نہیں سمجھا جیسے سمجھا رہا ہے

اس کو کیا معلوم
جس کو کنکروں اور پتھروں پر
چڑھ کے روزانہ وہ اب تک بانگ دیتا ہے
وہ گنگا گھاٹ پر آئے
تو اس کو مت نظر پائے

کچھ بولو بھی ٹھا کر

(سوامی رام کرشن پرم ہنس کی وفات پر)

ان اجلے اجلے بگوں کی وہ اجلی روشنی

ان آنکھوں کو کھوج رہی ہیں جن سے ان کا

یگوں یگوں کا ناتا ہے

جن اجیلی آنکھوں سے اجیالا بھی شرماتا ہے

بوڑھا برگد دم سادھے خاموش کھڑا ہے

’ماں‘ کے دوار پہ سو کھے پیلے پتوں کا اک ڈھیر لگا ہے

محصور رہتا

بہت گڈ مڈ تھے
 روز و شب کے وہ سب تانے بانے اور
 نہ میں مشاق تھا ایسا
 کہ چادر کوئی بن لیتا

مگر محصور تھا
 اور جانتا تھا یہ مشقت
 کاٹنا قسمت میں آیا ہے
 سو جیسے بن پڑا یہ کام بھی پورا کیا میں نے

پہ اب جب دیکھتا ہوں
 اپنے روز و شب کا حاصل
 یعنی وہ چادر

تو کہتا ہوں
 کہ اے لوگو!

اے ہمسرا میرے دفن کر دینا
 کوئی پوچھے تو کہہ دینا
 ارے چھوڑو، چلو اک چائے پیتے ہیں

موسمِ ہاجر میں

تمہاری آنکھ بھی ہر روز کاجل سے سنورتی ہے
مجھے بھی شیو کرنے میں کبھی ناغہ نہیں ہوتا

کارِ جہاں دراز ہے

کوئی ایسا شغل تو ہوزیت کرنے کا
 جسے واجب سا کوئی نام دے دیں
 خواہ اس میں قصہ رنگ پریدہ کی
 کوئی تمثیل ڈھونڈیں یا کسی اک یاد کو
 وہ اسم دے دیں، جو گذرتے وقت کا
 کوئی بھلا عنوان طے پائے
 کوئی مصرع کہیں تازہ جو اپنے آپ میں کامل نظر آئے
 اگر ایسا نہیں ممکن تو کوئی قہقہہ
 لمبا سا پورا قہقہہ پھر
 ہم کسی اک شغل میں مشغول رہنا چاہتے ہیں

سفر نامہ

ہم بہر صورت وہی پرکار قصدہ رہے
 ذہن ماضی، حال، مستقبل میں سرگرداں رہا
 آنکھ جو فنکاری اور جانتی تھی
 اس مثلث سے رہائی، کھیل لڑکوں کا نہیں
 اپنے لیے راہِ مفرا یجاد کی، بیتے دنوں پر روئی
 آئندہ زمانوں کا عجب سا خوف لے کر
 حال سے مفرو و اراکِ سمتِ نامعلوم پر مرکوز کچھ ایسے رہی
 کب، کہاں، کیسے گئی عمر عزیز احساس ہی باقی نہیں
 اور ہم بہر صورت وہی پرکار قصدہ رہے
 دائرہ در دائرہ کچھ اس طرح زندہ رہے
 آنکھ ہی روئی کبھی اپنی نہ شرمندہ ہوئے

زندگی

وقفے وقفے سے تاروپودِ نفس
 کبھی باہم ، کبھی پراکندہ
 کبھی چادر کوئی بُنی ایسی
 اوڑھ کر یوں لگا کہ میں زندہ
 کبھی تن ڈھانپنے کی کوشش میں
 پہروں بیٹھے رہے ہیں شرمندہ
 ان تضادوں کی تھاپ پر اب تک
 ذہن میں اک سوال رقصندہ
 زلیّت ارزاں ہے یا کہ ارزندہ

محتسب

مری زمیں کا
 طول و عرض ناپنے کے ساتھ ساتھ
 جاسید ادی کاغذات میں
 یہ اور لکھنا
 آسمان کا رقبہ بھی درست ہے

حبا من لا گے

(نذر امیر خسرو)

قیافے سے یہ اندازہ نہیں ہوتا
 بہت اندر اسی گوشے میں
 جس میں صرف تم کو
 آمد و شد کی اجازت ہے
 بہت کچھ پاکے بھی
 اس گوشہ پنہاں میں
 دائم چارتر کی ساز پر
 اک رقص قائم ہے
 یہ کیفیت دما دم ہے

دفعہ ندارد

ہر اک الزام سے
تا عمر باعزت بری ہو تم

تمہارے حق میں
بس اتنی سزا ہے
تم مجھے مجبورم بنا دیکھو

مرے حق میں
سزائے زندگی

شکست

مجھے اپنے بیرون کی جستجو تھی
 کہ وہ آنکھ سے اپنی دیکھا تھا میں نے
 جزائر

وہ سب ریختہ نار سیدہ جزائر
 خلاؤں میں بکھرے گئے
 زیت آثار کے شاخے جن میں تھے
 اب مری جستجو یا ہوس کا
 ہدف بن گئے تھے

میں ان کی تمنائے
دلکش و مست راہوں میں
اک عمر گھوما کیا
ماہ و انجم کو چوما کیا

اور گلِ شام
بعد از سفسر
باہزاراں ظفسر
اپنے بیرون کی دستیابی کے
جشنِ طرب میں
میں جب شادماں تھا
یہاں یک نگہ
اندروں کی طرف مڑ گئی
اک شکستِ عجب ذات سے جڑ گئی

تجزیہ

آج جس تناظر میں
کائنات کو دیکھا
ہر طرح مکمل تھی

پہلے اتنی شدت سے
کب خیال آیا تھا
اس قدر اکیلا ہوں

چند لمے

چند لمے
 گوشہٴ ناگفتگو میں بیٹھ جاؤ
 سانس لے لو
 زیت کی بوتل سے لے لو
 ذہن کو آرام دو
 اور اپنے ہر معلوم سے کچھ
 روح کو آگاہ ہونے دو
 (خود کو خود سے راہ ہونے دو)

تم سے تم تک
 کس طرح حائل ہوا ہے
 رفتہ رفتہ ایک بعد المشرقین
 اندر اندر کس طرح کا ہے یہ بین
 حبان لینے دو
 مان لینے دو
 اور اپنے درمیاں اک
 زندگی کا راستہ ہموار ہونے دو

کیا مشینوں کی طرح
 سرگرم کار طے شدہ ہو
 ایک جنس بے بہا ہو
 (بے مزہ ہو)
 زندگی سے زندگی سرشار ہونے دو
 زندہ ہونے کا ذرا اظہار ہونے دو

خدا کی زمیں کشادہ ہے

زمین تنگ کچھ ایسے ہوئی

اماں نہ ملی

میں پاشگستہ

عروس البلاد میں تنہا

بھٹک رہا تھا مگر

زیرت کے کوئی آثار

کہیں سمجھائی نہ دیتے تھے

ناامیدی کا

عجیب حکم رواں تھا

کہ جال بلب تھا میں

بہ طور وقت گزاری
 ”نظام رنگ“ * کہ میں
 الٹ رہا تھا ورق
 ناگہاں تمام وجود
 عجیب نور سے سرشار یوں ہوا جیسے
 غبارِ ابر سے نکلا ہو چاند سا جیسے

ہو ایوں حضرت والا نے ایک نکتہ خاص
 ہزار لطف کہ تعلیم مجھ کو فرمایا
 بس اک نگاہ قیافے پہ کی، توقف سے
 گناہ گار سے گویا ہوئے
 اے شہرام!
 ملول کیوں ہو
 ’خدا کی زمیں کشادہ ہے‘

* ڈاکٹر اسلم فرخی کا تالیف کردہ حضرت نظام الدین اولیا کا خاکہ

ساعتِ جاویداں

دامنِ شب میں
 کسی نورِ ہفت کی طلب
 مجھ کو تاریکی بے پایاں سے
 اس جگہ دور لیے جاتی ہے
 جہاں غمناکی شب کے کوئی آثار نہیں

ایک ہی نقطے پہ مرکوز آنکھیں
 اتنی مرکوز کہ اطراف و جوانب سے سروکار نہیں
 اور اس ساعتِ جاویداں میں
 کون سی شے ہے کہ جو نور سے سرشار نہیں

اپنا اپنا دکھ

بچپن سے

اماں سے سنا کرتے تھے

’پانچوں انگلیاں ایک برابر نہیں ہوتیں‘

لیکن پچھلے کچھ برسوں سے

اماں منجھلی انگلی کو

کھینچ رہی ہیں

کہتی ہیں:

’اس کو کیسے چھوڑوں
پیچھے رہ جائے گی‘

’منجھلی انگلی بھی تو آخر جانتی ہوگی
’پانچوں انگلیاں ایک برابر نہیں ہوتیں‘

پیچھے رہ جانے کا دکھ تو منجھلی انگلی سہہ جائے گی
لیکن چھوٹی انگلی؟؟؟

جسے دبا کر
اماں منجھلی انگلی کھینچ رہی ہیں

پھر چاند بادل میں چھپا ہے

پھر چاند بادل میں چھپا ہے
 اور ہوا خاموش ہے
 اتنے بڑے اس آسمان پر
 اک ستارہ بھی نہیں ہے
 بے نصیبی کی عجب یہ رات ہے
 امید کا کوئی شرارہ بھی نہیں ہے

مگر اے جانِ من
 تم کیوں پریشاں ہو
 کہ تو کیوں ہر اس سال
 یہ سب منظر ہیں
 اور منظر کوئی بھی دائمی کب ہے

چلو ان بولتی آنکھوں سے بولو
 حبال فزالب سے
 وہی امرت کلش کھولو
 تمہارے دودھیا گالوں کے بادل میں
 وہ جواک چاند ہے دکھلاؤ
 جانم مسکراؤ
 اس طرف آؤ
 تمہاری الجھی زلفیں
 اجلے چہرے سے ہٹاؤں میں
 تمہیں تم سا بناؤں میں

کئی دن ہو گئے ہیں
 میسرے ہونٹوں سے ہنسے تم کو
 مرے ہونٹوں سے کیسے ہنستی ہو تم
 ہنس کے بتلاؤ

عارفِ ہندی

(ایک مینا تور)

آشیاں کوئی بھی نہیں شاید
کاج کی اس بلند ٹہنی پر

بوریا اپنا کھول کر درویش
مست زیر درخت
خاک بہ تخت

برگ بے رنگ، رنگ بھرتا ہوا
شوراک دور پاس ابھرتا ہوا
'یار سے جو ملا وہ جانے یار'

میں ہار گیا

بہت وثوق سے
 کچھ بھی بتا نہیں سکتا
 بس اتنا جانتا ہوں
 فکر سے رہائی کا
 مقدمہ جو چلا تھا
 میں اس میں ہار گیا

ہجبر کی رات ایک نعمت ہے

ذرا نظارہ حیات کرو

چاند آغوش میں بھرو جاناں
شہر بھر میں جنوں کرو جاناں
ہجبر کی رات ایک نعمت ہے
آہ یہ رات خوب صورت ہے

اپنی تنہائیوں سے بات کرو

یادِ ایا مے

بارہا چاہا تھا تیرے زم گیسو
 چوم لوں اور انگلیوں سے
 ایک اک لٹ کو سنواروں
 اور ترے چہرے کے اجلے چاند کو
 جو گرد کی چادر تلے دب سا گیا تھا
 اپنے ہاتھوں سے ابھاروں

ساحلوں سے آرہے تھے
 منچلے جھونکے ہوا کے
 چاہتے تھے تیرے گیسو کو اڑا کے
 تیرے چہرے پہ سجا کے
 چودھویں کی رات کا منظر بنائیں
 ان کبھی اک داستاں ایسے سنائیں
 ہنس پڑے تو

تیری آنکھوں کی چمک سے
 تیرے ہونٹوں کی کھنک سے
 خامشی ٹوٹی ترے ان نرم گیسو کی
 ترے چہرے کا احساں دیا نور والا تھا
 مری دنیا نے شب آثار میں ہر سمت احساں ہی احساں تھا

میں مانتا ہوں کہ تو خدا ہے

فساد ممکن نہیں ہے
 اس واقعے سے فساد جو ہو گا واقع
 فضول فردا کا خوف امروز ہو رہا ہے، جو کچھ ہوا ہے
 اسی پہ کچھ اختیار کب تھا
 اسی پہ کچھ اختیار کب ہے

یہ نیک و بد، ناخوشی، خوشی کی
تمام تشخیصیں صرف تشخیص تک حقیقت
حقیقتوں، نا حقیقتوں کے تمام اندازے سچ سے خالی
سبھی خیالی

کوئی بھی معیار طے کہاں ہے
اذاں نہ دے گا جو مرغ کوئی
سحر نہ ہوگی؟
جو مست ہیں ان کو کیا جہاں کی
خبر نہ ہوگی؟
جو بے مسازی ہیں ان کو جنت نہیں ملے گی؟
جو بے وفا ہیں انہیں محبت نہیں ملے گی؟

کوئی بھی معیار طے کہاں ہے
زمین محور پہ گھومتی ہے
پہ وقت اپنی جگہ کھڑا ہے ازل سے یونہی
فسا کی بستی کے لوگ فانی

بسی ہے بستی کسی کے نعم البدل سے یونہی

عجب تضادات غیر منطق

خدائے صادق

کوئی تو معیار کیجیے طے

ہماری بفضول کی آخری لے

ٹھہرنے جائے

یہ عمر یونہی سیاہ روحوں کے زیر سایہ

گذرنے جائے

کوئی بھی معیار طے نہیں ہے

تو کس لیے پھر گنہ کا احساس مجھ کو اندر سے کھا رہا ہے

میں صدق دل سے یہ مانتا ہوں کہ تو خدا ہے

تو اور کیا مجھ سے چاہتا ہے

میں جانتا ہوں

(میں جانتا کچھ نہیں ہوں)

میں جانتا ہوں
 کہ میری آنکھوں کے کینوس پر
 تمہارے چہرے کا
 سبز و شاداب رنگ میں ابھرنا
 ہزار انداز سے سنورنا
 بہار کی مستقل اقامت
 حیاتِ تازہ کی اس بشارت کا سلسلہ ہے
 جو انتہاؤں سے ماورا ہے

تمہارے سب خدو خال
وہ نکاہری ہوں یا باطنی ہوں
میری نگاہ میں ہیں
گزشتہ سب ماہ و سال
وہ گفتنی ہوں، ناگفتنی ہوں
اب تک دماغ و دل کی پناہ میں ہیں
عجب عجب احتمال
وہ سرسری ہوں یا دائمی ہوں
وہ لازمی ہوں یا غیر لازمی ہوں
سوال کرتے ہوئے جوابات راہ میں ہیں

حقیقتوں تک رسائیوں کی
جو صورتیں دستیاب ہیں وہ
نہ صرف ادھوری ہیں
بلکہ ہمسل ہیں
اک خسل ہیں دماغ کا سب
(دماغ جو لازماً سب سے اب تک

شعور سے لاشعور اور
 لاشعور سے پھر شعور تک کی
 مسافتوں کے نہ جانے کن دائروں میں
 پل پل بھٹک رہا ہے)

میں جانتا ہوں
 میں جانتا کچھ نہیں ہوں
 مجھ کو ذرا بھی کوئی خبر نہیں ہے
 مگر یقین ہے
 تمہارے چہرے کا
 سبز و شاداب رنگ میں ابھرنا
 ہزار انداز میں سنورنا
 بہار کی مستقل اقامت
 حیاتِ تازہ کی اس بشارت کا سلسلہ ہے
 جو انتہاؤں سے ماورا ہے

سردہ باد

ہاں اسی شب گزیدہ خطے سے
 صبح کی جستجو میں نکلے تھے
 'سر پھرے چند، چند سودائی'
 جلوۂ صبح کے تمنائی

کوہساری پناہ گاہوں سے
 تنگ و نادیدہ خفیہ راہوں سے
 لشکرِ شب پہ وار کرتے تھے
 صبح کا انتظار کرتے تھے

اک مسلسل نبرد ، سر انجام
 تیرگی کا شکستِ فاش اتمام

اب بھی ہیں ساکنانِ شہر کو یاد
 سبھی باعزم و جاں فدا افراد
 ایک نعرہ بلند : 'مردہ باد'

جدائی کی پہلی شام

سیلف پورٹریٹ

چپلیں بن بدیوں کی پاؤں میں

آنکھوں پر بے شیشہ چشمہ

سر کی ٹوپی کا تلاغ سائب

میلا پا جامہ، رومالی پارہ پارہ

اور اس پر

دست و پائیں بے زباں

آنکھ عاری فکر سے

کھو چکے ہیں ہونٹ اپنی قوتِ بینائی بھی

قنوطیت پسندوں کے نام

زمیں

تیزا بیتی ہوئی

جیسے ہانڈی پر رکھی

رکابی کوئی

جائے تسکین نہیں

آسمان

اوندھے منہ

اک کڑھائی کی مانند

بے بس پڑا

حوصلہ کھو چکا

اور سمندر
 وسیع و کشادہ
 مگر ذائقہ
 کاٹ تلوار کی
 جوں کی توں تنگی

اک مشلت
 زمیں۔ آسمان اور سمندر
 سکون۔ حوصلہ۔ قطرہ آب
 (دیوانے کا خواب)
 اگر سن رہی ہو خدائی
 عطا ہو رہائی

تماشا

کاروبارِ زیت کا
کر رہا ہوں مستقل

ایک دردِ جباں گھل
ایک جانِ مضحل
بس یہی اثاثہ ہے

وقت سے فرار کا
کوئی راستہ نہیں
کیا عجب تماشا ہے

کارِ بیہودہ

اپنے ہونے
 اور نہ ہونے میں
 خوشی کی، غم کی، اطمینان کی تحقیق
 بے مصرف ہے
 اور اک سعیِ لاحاصل سوا کچھ بھی نہیں

یہ زندگی
 اک جنگِ تھمیلی ہے
 اور میں
 بے نتیجہ جنگ کا سرباز ہوں کوئی
 جو یہودہ سوالوں سے
 ازل سے برسرِ پیکار
 - ابد آثارِ ناپیدا

مسائل -

تارِ ابریشم

وجود -

اک کرم کی مانند
 غائب ہو رہا ہے دم بہ دم
 یہ بھی غنیمت تھا مگر
 ریشم کے خواہاں ہی کہاں باقی

کبھی یہ سوچتا ہوں میں
 کسی گوشے میں بیٹھوں

اور رجوع اک مردِ کامل سے کروں
لیکن

مجھے بھی تو یہ پہلے جاننا ہوگا کہ
طفل عقل

کیوں از بلخ تا بہ قونیہ
یوں خواب میں ڈوبا رہا

یا پھر
اسی ایک یاد کو عنوان دے دوں زیست کا
تو نو دمیدہ وہ کلی

شامل ہوئی یا کئی گئی
جو زندگی میں

جس کی خوشبو نے مرے گھر کو مہک سے بھر دیا
طوطی خوش رنگ و الحال کی چہک سے بھر دیا

میں اک محقق بھی رہا ہوں
ہفت سالہ دورہ تحقیق کا

حاصل یہی ہے
 سر بہ زانو، دم بہ خود ہوں
 آخرش صادق ہدایت
 خود کشی سے چاہتا کیا تھا

نتیجہ صفر ہے

یہ کارِ بیہودہ

یوں ہی ہوتا رہا ہے

بے سبب ہوتا رہے گا

تحرک

حرکت خاک کا وجود و شہود
 حرکت اس کا اس زمیں پہ نمود
 حرکت فکرِ نان و جائے اماں
 حرکت جستجوئے شورِ نہاں
 حرکت ارتقائے تودہٴ خاک
 حرکت بر گفتنِ افلاک

حرکت لے ، جڑا ہے جس سے سے
 حرکت ہی ثبوتِ ہستی 'ہے'
 اور سے دھوپ چھاؤں کی گردش
 شہر کی سمت گاؤں کی گردش
 گردشِ انقلابِ روز و شب
 انقلابِ ارتقائے انسانی
 اس سے آگے فنا کا دروازہ
 اس سے آگے بقائے لافانی

فسریدون کے نام (میر اپٹا)

میں تجھ کو دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں تو ہے یا
نشاۃ ثانیہ ہے
میرے عہدِ رفتہ کا

باز آمد

(سرسید کی ایک سوویں سالگرہ پر)

تمہارا شہر ہے

لیکن

صدی گزرے یہاں آئے ہو

ممکن ہے کسی شے سے

کہیں نا آشنائی کا

کوئی احساس جاگ اٹھے

سو میں اتنا کہوں گا بس

تمہارا گریہ شب، وہ سہانا خواب اور وہ سجدۂ حاجات

سب کچھ رب عزت کو پسند آیا

مگر ہم لوگوں کو تعبیر کے لائق نہیں پایا

لوحِ ایام

عقائد کرم خوردہ
خطِ نامعلوم میں لکھی کتابوں میں
کہیں محفوظ ہیں
'معلوم' کی بنیاد نامعلوم پر
اک مضحکہ
یہ سلسلہ منسوخ کب ہوگا

میں جو کچھ مانتا ہوں، جاننا ہوگا
مجھے یہ جاننا ہوگا
کہ میں اک دن
درِ دنِ قبر، زیرِ خاک
خاکِ سرد و ناہموار میں سو جاؤں گا

اور میرے چہرے، ہونٹوں پر
 اور آنکھوں، کانوں میں
 چلیں گی چیونٹیاں، رستے بنادیں گی
 ہوا تھارو نما جس سے، مجھے اس میں ملادیں گی

مجھے یہ جاننا ہوگا
 کہ اک دن میں نہیں ہوں گا
 مگر یہ روز و شب
 یہ شادی و غم
 دشت، دریا، کوہ
 اور یہ زندگی کا شور، بال تغییر سب باقی رہے گا

ہاں مجھے یہ جاننا ہوگا
 کہ گرچہ میں نہیں ہوں گا
 یہ میرا حق و ناحق
 ثبت ہوتا جا رہا ہے
 اور سدا باقی رہے گا

حمد

ابھی تو دستِ دعا بھی نہیں بلند مرے
 ابھی تو حرفِ تمنا بھی آشکار نہیں
 ابھی تو اس کی مدد کا بھی انتظار نہیں
 اتر رہی ہیں ابابیل کس لیے آخر
 ابھی تو ذکرِ عدو، فکرِ کعبہ کی بھی نہیں
 خدا تو وقت سے آگے نکل گیا شاید

عشق بازپچه و حکایت نیست
حکیم سنائی

غزلیں



بنامِ عشق اک احسان سا ابھی تک ہے
وہ سادہ لوح ہمیں چاہتا ابھی تک ہے

فقط زمان و مکاں میں ذرا سا فرق آیا
جو ایک مسئلہ درد تھا ابھی تک ہے

شروعِ عشق میں حاصل ہوا جو دیر کے بعد
وہ ایک صفرِ تہ حاشیہ ابھی تک ہے

حلول کر چکی خود میں ہزار نقش و رنگ
یہ کائنات جو خاکہ نما ابھی تک ہے

طویل سلسلہٴ مصلحت ہے چار طرف
یقین کر لے مری جاں خدا ابھی تک ہے



مگر یہ قصہ تب کا ہے کہ جب اس کے قریں تھے ہم
یہ سارا آسمان اپنا تھا، خوش باش و صیں تھے ہم

یہیں ہاں جس جگہ اب خاک اڑتی پھرتی ہے ہر سو
یہیں اپنے مکاں تھے جن میں برسوں تک مکیں تھے ہم

گذشتہ رات سنتے ہیں بہت ہی تیز آندھی تھی
گذشتہ رات لیکن شہر سے باہر کہیں تھے ہم

سوادِ نامرادی میں بریدہ پر پھڑکتے ہیں
مگر کچھ یاد پڑتا ہے کہ بازوئے یقیں تھے ہم

نہ جانے کارِ دنیا کس طرح اس آگیا اتنا
کہ یوں مصروف تو کارِ جنوں میں بھی نہیں تھے ہم



فضا ہوتی غبار آلودہ ، سورج ڈوبتا ہوتا
یہ نظارہ بھی دلکش تھا اگر میں تھک گیا ہوتا

ندامت ساعیتیں آئیں تو یہ احساس بھی جاگا
کہ اپنی ذات کے اندر بھی تھوڑا سا خلا ہوتا

گذشتہ روز و شب سے آج بھی اک ربط سا کچھ ہے
وگر نہ شہر بھر میں مارا مارا پھسر رہا ہوتا

عجب سی نرم آنکھیں ، گندمی آواز ، خوشبوئیں
یہ جس کا عکس ہیں اس شخص کا کچھ تو پتہ ہوتا

مسائل جیسے اب درپیش ہیں شاید نہیں ہوتے
اگر کارِ جنوں میں نے سلیقے سے کیا ہوتا



براہِ راست نہیں پھر بھی رابطہ سا ہے
وہ جیسے یادِ مضافات میں چھپا سا ہے

کبھی تلاش کیا تو وہیں ملا ہے وہ
نفس کی آمد و شد میں جہاں خلا سا ہے

یہ تارے کس لیے آنکھیں بچھائے بیٹھے ہیں
ہمیں تو جاگتے رہنے کا عارضہ سا ہے

یہ کائنات اگر ویسی ہو تو کیا ہوگا
ہمارے ذہن میں خاکہ جو اک بنا سا ہے

زمینِ مدار پہ رقصاں ہے صبح و شامِ مدام
گرے کے چار طرف اک محاصرہ سا ہے



مجھے تسلیم بے چون و چیرا تو حق بجانب تھا
مرے انفاس پر لیکن عجب پندار غالب تھا

وگر نہ جو ہوا اس سے سوائے رنج کیا حاصل
مگر ہاں مصلحت کی رو سے دیکھیں تو مناسب تھا

میں تیرے بعد جس سے بھی ملا تیکھا رکھا لہجہ
کہ اس بے لوث چاہت کے عوض اتنا تو واجب تھا

میں کچھ پوچھوں بھی تو اکثر جواباً کچھ نہیں کہتا
گذشتہ ایک عرصے سے جو بس مجھ سے مخاطب تھا

میں عمر رفتہ کی بازی سے اتنا ہی سمجھتا ہوں
شکست و فتح دو حرفِ انسانی کھیل جالب تھا



بدل جائے گا سب کچھ یہ تماشا بھی نہیں ہوگا
نظر آئے گا وہ منظر جو سوچا بھی نہیں ہوگا

ہر اک لمحہ کسی شے کی کمی محسوس بھی ہوگی
کہیں بھی دور تک کوئی خلا سا بھی نہیں ہوگا

سمٹ جائے گی دنیا ساعت امروز میں اک دن
شمار زیست میں دیروز و فردا بھی نہیں ہوگا

مگر قد روز و شب کا دیکھ کر حیران سب ہوں گے
مدار اپنا زمیں نے گرچہ بدلا بھی نہیں ہوگا

عجب ویرانیاں آباد ہوں گی قریہ در قریہ
شجر شاخوں پہ چڑیوں کا بیرا بھی نہیں ہوگا



ہم اپنے عشق کی بابت کچھ احتساب میں ہیں
کہ تیری خوبیاں اک اور خوش خصال میں ہیں

تمیزِ ہجر و وصال اس مقام پر بھی ہے
حسابِ راہِ محبت میں گرچہ حال میں ہیں

کوئی بھی پاس نہیں تو، ترا خیال نہ غم
بقولِ پیرِ جہاں دیدہ ہم وصال میں ہیں

بہت ضروری نہیں ہے کہ تو سبب ٹھہرے
یہ بات اپنی جگہ ہم کسی ملال میں ہیں

گذشتہ سال رہا جن پہ تنگ عرصہ وقت
وہ سارے خواب بہ تعبیر اب کے سال میں ہیں



ندی تھی، کشتیاں تھیں، چاندنی تھی، جھرنا تھا
گذر گیا جو زمانہ کہاں گذرنا تھا

مجھی کو رونا پڑا رنجگے کا جشن جو تھا
شب فسراق وہ تارہ نہیں اترنا تھا

مرے جلال کو کرنا تھا خم سر تسلیم
ترے جمال کا شیرازہ بھی بکھرنا تھا

ترے جنون نے اک نام دے دیا ورنہ
مجھے تو یوں بھی یہ صحرا عبور کرنا تھا

اک ایسا زخم کہ جس پر خزاں کا سایہ نہ تھا
اک ایسا پل کہ جو ہر حال میں ٹھہرنا تھا



متاعِ پاسِ وفا کھو نہیں سکوں گا میں
کسی کا تیرے سوا ہو نہیں سکوں گا میں

سدا رہے گا ترو تازہ شاخِ دل پر تو
فضول رنج کہ کچھ بو نہیں سکوں گا میں

تو آنکھیں موند لے تو نیند آئے مجھ کو بھی
تو جانتا ہے کہ یوں سو نہیں سکوں گا میں

مجھے وراثتِ غم سے بھی عاق کر ڈالا
یہ کیسا لطف کہ اب رو نہیں سکوں گا میں

بہت حسین ہے جہاں، زندگی بھی خوب مگر
مزید بارِ نفس ڈھو نہیں سکوں گا میں



ساعتِ ہجر کٹ گئی عشقِ جوان ہو گیا
شہر میں عرصے بعد پھر امن و امان ہو گیا

جس کے بغیر زیست کا ذہن میں خاکہ تک نہ تھا
کیسے وہ شخص یک بیک وہم و گمان ہو گیا

دل کے معاملات کی ہم کو بھی تھوڑی فہم ہے
کیا کہیں دوستو! یہاں جاں کا زیاں ہو گیا

ہم کو بھی فخر ہے کہ ہم رکھتے تھے اپنے سر پہ چھت
کوئی مکاں ملا نہ تھا دردِ مکان ہو گیا

ایک نئے سفر پہ اب ہونا ہے ہم کو گامزن
پاؤں بھی لڑکھڑا اٹھے رستہ ڈھلان ہو گیا



نہ ہم گدا ، نہ کسی کو پکارا کرتے ہیں
فقیر ہیں گذراں پر گزارا کرتے ہیں

جو پہلے کرتے رہے گوشہ ہائے خلوت میں
وہ ذکرِ یاد ترا آشکارا کرتے ہیں

جتن کریں بھی تو آنکھوں سے محو ہوتے نہیں
جو نقشِ یہ در و دیوار ابھارا کرتے ہیں

کیا ہے پھر نظر انداز اس نے اہلِ دل
چلو کہ کارِ جنوں بھی دوبارہ کرتے ہیں

اب اس کے بعد وہی دشتِ ہو، وہی رم ہے
وہی تلاشِ ختن ہے ، نظارہ کرتے ہیں



وہ ایک لمحہ رفتہ بھی کیا بلا لایا
طویل قصہ ہے بتلاؤں کیا کہ کیا لایا

جہاں کہیں بھی گیا ساتھ تھا غبارِ حیات
کہاں سے خاکِ پریشاں یہ میں اٹھا لایا *

مرے نصیب میں تھا عشقِ جاوداں لکھا
وگر نہ کیوں میں تری یاد کو بچا لایا

کہیں بھی کچھ بھی بہ ترتیب تھا نہ واضح تھا
بس ایک خاکہ مبہم سا تھا، بنا لایا

* ماخوذ از بیدل دہلوی



اہلِ دل الزام ہے یہ اور بہت سنگین ہے
اس کو کہتے کب سنا وہ مجھ میں غمگین ہے

زخمِ دل سرسبز رکھنا ایسا کچھ مشکل نہیں
آج بھی ان آنسوؤں کا ذائقہ نمکین ہے

ہو چکے ہیں راکھ میں تبدیل سب جذبے اگر
حساں بحق ہونے کی ہم کو کس لیے تلقین ہے

کیا تغافل کا گلہ اس سے کیا جائے کہ جب
دوستو دل جانتا ہے وہ بھی اک مسکین ہے

کیا افتخار پر اپنا بھی تارہ کہیں روشن ہے یا
بے سبب ہی آسماں پھر اس قدر رنگین ہے



نصیب چشم میں لکھا ہے گر پانی نہیں ہونا
تو کیا یہ طے ہے اب رُج پشیمانی نہیں ہونا

سکوں سے جا لگے گی دل کی کشتی اپنے ساحل سے
کہ اس برسات میں دریا کو طوفانی نہیں ہونا

سبھی کچھ طے شدہ معمول جیسا ہونے والا ہے
کسی بھی واقعے کو وجہ حیرانی نہیں ہونا

جنوں میں ممکنہ حد تک رہے گا ہوش بھی شامل
مری جاں بے ضرورت کارِ نادانی نہیں ہونا

ہمیں ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جن کے نصیبوں میں
خدا نے صاف لکھا ہے : 'پریشانی نہیں ہونا'



کن بلاؤں کا اثر گھومتا ہے
 بے سبب ہی مرا سر گھومتا ہے
 اب ٹھہر بھی جا مرے گھر میں تو
 دیکھ کب سے مرا گھر گھومتا ہے
 اک نہ اک دن تو نظر آئے گا
 تو سرِ بام اگر گھومتا ہے
 میرا سیارہ روشن اب تک
 دور افق پار ادھر گھومتا ہے
 جب سے ٹھہرا ہوں میں اپنے اطراف
 یہ کرہ شام و سحر گھومتا ہے



خلا سا ٹھہرا ہوا ہے یہ چار سو کیا
اجبڑ ہو گیا اک شہر رنگ و بو کیا

تمام حلقہ خواب و خیال حیراں ہے
سودا چشم میں آیا یہ ماہر و کیا

بکھی جو فرصت یک لمحہ بھی ملے تو دیکھ
کہ دشت یاد میں بکھرا پڑا ہے تو کیا

اگرچہ شورہ ہی شورہ ہے سب علاقہ دل
تجھے رکھا ہے مگر سبز و پر نمو کیا

دیارِ دل میں کئی دن سے شام ہوتے ہی
دھواں سا پھیلنے لگتا ہے کو بکو کیا

ذرا جو سوچیں تو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے
کہ ہونا چاہیے اب رنگ آرزو کیا



آخر دم تک نہ دل سے یہ پشیمانی گئی
قدر تیری ہمدم جانی نہ پہچانی گئی

ہم جو چاہیں گے بہر صورت وہی اب ہونا ہے
یہ یقین آجائے تو ساری پریشانی گئی

لوگ بھی سب شاد تھے اور گھر بھی سب آباد تھے
کس سلیقے سے گذر کر رات طوفانی گئی

سب علی الاعلان جس کے معترف اور معتقد
ہم سے تنہائی میں بھی وہ بات کب مانی گئی

کیا مسزہ دیتا ہے بعض اوقات کوئی جھوٹ بھی
جیسے یہ افواہ : 'دل سے غم کی سلطانی گئی'



کر گذر جائیں گے پہلے سے زیادہ اب کے
ملتوی کر دیا جینے کا ارادہ اب کے

پھر تصور میں وہی شکل ابھی ابھری تھی
کینوس آنکھ کا پھر رہ گیا سادہ اب کے

پھر وہی گندمی آواز سنائی دی ہے
پھر سے آباد ہے سناٹوں کا جادہ اب کے

اس کے اڑتے ہوئے رنگوں کا تعاقب یارو
سوچتے ہیں کہ کیا جائے پیادہ اب کے

خود کو تقسیم تو کرنا ہے اسی پر پھر کیا
آدھا کر دیں گے ذرا بعد میں آدھا* اب کے

(*) اہل علم سے معذرت طلب ہوں)



ان دنوں کا ذکر ہے جب اس کو دیکھا بھی نہ تھا
ذہن میں واضح کوئی حرف تمنا بھی نہ تھا

اب مگر وہ دل کے قریے قریے میں آباد ہے
ہاں گذشتہ وقت میں کچھ اتنا پیارا بھی نہ تھا

اور آنکھیں اک عجب سے نور سے سیراب تھیں
اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھا چپاند نکلا بھی نہ تھا

اس قدر سرشار تھے ہم پیار کے احساس میں
طے ہوئی کب وصل منزل دھیان آیا بھی نہ تھا

آج سوچوں تو کوئی اک خواب سا لگتی ہے وہ
اس سے ملنا ، باتیں کرنا خواب ایسا بھی نہ تھا



رہِ وفا میں رہے یہ نشانِ خاطر بس
بغیر نام ہو مذکور ہر مسافر بس

ہزار وادیِ تاریک سے گذرتا ہوا
یہ عشق چاہتا ہے ہو ترا معاصر بس

طویل مرحلہٴ جستجو بھی تھا درپیش
سو اتفاق نہیں تھا ہوا وہ ظاہر بس

پھر اس کے بعد بھی ہو گیا ادھر کا ادھر
وہ ایک لمحہٴ موجود میں تھا حاضر بس

یہ اک جزیرہٴ بے راہ بھی نہیں رہنا
تو کیا قریب ہے وہ مجمعِ الجزائر بس



عنایت ہے تری بس ایک احسان اور اتنا کر
مرے اس درد کی میعاد میں بھی کچھ اضافہ کر

گماں سے بھی زیادہ چاہیے سرسبز کشت جاں
لفظ پچھلے پہر کیا ہر پہر اے آنکھ برسا کر

تو پھر اکرام کیا شے ہے جو تنہائی میں تنہا ہوں
کوئی محفل عطا کر قاعدے کی اس میں تنہا کر

نفس کی آمد و شد رک نہ جائے پیشتر اس سے
زمیں کو اور نیچا، آسماں کو اور اونچا کر

بہت ممکن ہے میری باتیں بے معنی لگیں تجھ کو
انہیں مجذوب کی بڑ جان اور چپ چاپ سوچا کر



بحبایہ شہر ذرا بھی تو دیکھا بھالا نہیں
مگر تو حوصلہ رکھ میں بھٹکنے والا نہیں

وہ دیکھ روشنیوں سے بھرا ہے پس منظر
ملول کیوں ہے اگر سامنے اجالا نہیں

کہاں کہاں نہیں ٹوٹا ہے سانس سے رشتہ
کہاں کہاں ترے انفاس نے سنبھالا نہیں

تو مجھ کو دیکھ کے حیران اس قدر مت ہو
ہزاروں ہیں مرے جیسے میں کچھ زالا نہیں

میں رات غم کا طلبگار تھا مگر اس نے
بجز خوشی مرے کا سے میں کچھ بھی ڈالا نہیں

اک ایک حرف مرا انتساب تیرے نام
بلا سے حاشیے میں گر کہیں حوالہ نہیں



مثالِ مژہ قند و نبات ایسا ہی
رہا ہے درد کوئی ساتھ ساتھ ایسا ہی

تو بھول پانے میں دشواریاں بہت ہونگی
کیا ہے پیار حد ممکنات ایسا ہی

برس گذر گئے اس سے جدا ہوئے لیکن
عجیب بین ہے موج فسات ایسا ہی

میں جس سے خوف زدہ تھا شروع سے آخر
تمنا کر گئی یہ کائنات ایسا ہی

کوئی بھی رنگ میسر نہ آسکا تو پھر
قبول کر لیا رنگ حیات ایسا ہی



خشک تھا عرصہ تراوش بھی
دیدنی تھا طلسم بارش بھی

ذہن میں بھی نہ تھا کوئی چکر
معتبر تھی گرے کی گردش بھی

آنکھ کو بھی شعور دید نہ تھا
سرد تھی رونق نمائش بھی

زینہ زینہ اتر رہا تھا عشق
سایہ سایہ تھی جسم خواہش بھی

پھر ہوا یوں گراں گذرنے لگی
اس پری چہرہ کی ستائش بھی

اور فسانہ تمام شد یعنی
تھم گئی اس مژہ کی جنبش بھی



اشک آنکھوں میں ہوں اور روؤں نہیں
معجزہ کہیے اسے افسوں نہیں

بال بھر بھی قد سے میں اچھلوں نہیں
خود سے چھوٹا بھی نظر آؤں نہیں

دن اگر دن سے ہوں راتیں رات سی
دشمنوں میں اس قدر الجھوں نہیں

لگ گئیں کیا اس کے بھی بیساکھیاں
تیزی سے یہ وقت ڈھلتا کیوں نہیں

دل تو کب سے چاہتا ہے دوستو!
جو بھی کرنا ہے کروں سوچوں نہیں

جھوٹ بھی مٹ جائے میری ذات سے
اور کوئی سچ بات بھی لکھوں نہیں



جہانِ دل میں افتاب کر دیا
دعا نہ تھے پہ مستجاب کر دیا

ہم اہلِ دل کی نسبتوں کے ہیں امیں
یہ لطفِ خاص ہے خراب کر دیا

یہ شاعری زکوٰۃ ہے کہ عشق نے
ہمیں بھی صاحبِ نصاب کر دیا

یہ عشق نامہ جمع جب کیا گیا
تمہارے نام انتساب کر دیا

ہے آرزو کہ قرض دار ہی رہیں
اگرچہ ہم نے سب حساب کر دیا

سفر، پس سفر اور اس پہ یہ کرم
سپرد حضرتِ شہاب کر دیا



حکراں جب سے ہوئیں بستی پہ افواہیں وہاں
دن ڈھلے ہی بین کرتی ہیں عجب راتیں وہاں

اک غروب بے نشاں کی سمت رستے پر ہوں میں
خوف یہ درپیش ہوں گی کیسی دنیا میں وہاں *

بارہا دیکھی ہے ان کوچوں نے شب مستی مری
آج بھی اک گھر کے بام و درشاسا میں وہاں *

کیا تجھے مسماری دل کی خبر کوئی نہ تھی
کس لیے بھیجیں نہ تو نے پھر ابابلیں وہاں

ایک دفعہ تو یہاں آ کر مجھے حیران کر
کیا ضروری ہے کہ تجھ سے ملنے آؤں میں وہاں

* ماخوذ از عبدالجبار کاکائی



تعارفات کی خاطر ذہین رہنا ہے
سو طے ہوا کہ ملول و حنین رہنا ہے

بجائے کہ دشت مناسب ہے ہر طرح سے مگر
جنوں میں اب ہمیں گوشہ نشین رہنا ہے

خوشی یہ ہے کہ ہر امید کی ہوئی تفسین
ملال یہ ہے کہ باقی یقین رہنا ہے

ہزار زاویہ روح میں وہ تو ہے جسے
بہ حیث صاحب خانہ مکین رہنا ہے

جو فصل یاد کو سرسبز گر رکھا جائے
جہان بھر ہمیشہ حسین رہنا ہے



میں نہیں روتا ہوں اب یہ آنکھ روتی ہے مجھے
روتی ہے اور سر سے پاؤں تک بھگوتی ہے مجھے

بدعسا ہے جانے کس کی یاد کی جو ہر گھڑی
ہر گزشتہ لمحے سے وحشت سی ہوتی ہے مجھے

ممکنہ حد تک میں اپنی دسترس میں ہوں مگر
پچھلے کچھ دن سے کوئی شے مجھ میں کھوتی ہے مجھے

مطمن تھا دن کے بکھراؤ سے میں لیکن یہ رات
دانہ دانہ پھر عجب ڈھب سے پروتی ہے مجھے

میں بہت مشاق اک تیرا تھا لیکن وہ آنکھ
دیکھ اب مع کشتی جاں کے ڈبوتی ہے مجھے



اس سے پہلے اس طرح گھر کو سبایا تو نہیں
دیکھنا دروازے کے باہر وہ آیا تو نہیں

دور پاس آنکھوں میں کوئی شہر بس آیا ہے پھر
یہ کسی ویرانی نو کا کسایہ تو نہیں

اس جگہ روشن ہے شاخِ دل پہ جو خورشید سا
وہ گذشتہ رت کا کوئی پھول سایہ تو نہیں

ہاں بہت مغموم تھا کل رات تیرے دھیان میں
جاں! چراغِ یاد کو لیکن بجھایا تو نہیں

ہاں ہر اک خوش چہرہ کو دل کھول کر دیتا ہوں داد
چہرہ سادہ پہ کوئی تجھ سا بھایا تو نہیں

تو بہت رویا ہے میری یاد میں اور روئے گا
اے وفا پیشہ مگر میں مسکرایا تو نہیں



میں خواب میں تھا اک آواز نے کہا یاہو
پھر اس کے بعد ہر اک سمت بس سنا یاہو

ہے اک نگاہِ قلندر کا لطفِ خاص کہ میں
بغیر خرقہ و کشکول کہہ اٹھا یاہو

یہ اتفاق نہ تھا باز آمدِ شبِ حجب
اشارہ تھا کہ ہے پھر دل میں گونجتا یاہو

بس ایک شعلہٴ پراں نظر سے گذرا اور
رگوں میں خوں کی جگہ دوڑنے لگا یاہو

میں دیکھتا تھا فضا میں بکھرتا الا اللہ
میں جانتا تھا یہی لا الہ تھا یاہو



ذرا بس کھولنا تھا اس کا گیسوئے پریشاں کو
جو باقی رہ گیا تھا سوپ آئے ہم بیاباں کو

جنوں ہنستا ہے اکثر چھیڑتا ہے ہم کو یہ کہہ کر
کشاہہ کیوں سمجھ بیٹھے تھے آخر دشتِ امکاں کو

سنا ہے دودھیا گالوں میں کوئی چاند دیکھا تھا
معالج پوچھتا تھا کیا مرض ہے چشمِ حیراں کو

ہمیں معلوم تھا میعادِ عمر ہجر بڑھنی ہے
سبب یہ تھا جو اں رکھنے کا دل میں وصلِ ارماں کو

مضمون اس قدر پیچیدہ شاید یوں نہیں ہوتا
متشخص کر دیا ہوتا جو ہم نے متنِ عنوان کو



سن رکھا تھا تجربہ لیکن یہ پہلا تھا مرا
جب کسی کے نام پر بے وجہ دل دھڑکا مرا

اک اچلتی سی نظر اس پر گئی اور یوں لگا
کھو گیا جیسے کہیں حرفِ تمنا سا مرا

عشق میں میں بھی بہت محتاط تھا، سب جھوٹ ہے
اور یہ ثابت کر گیا کل رات کا رونا مرا

ایک حرفِ حق کی تانوکِ زباں آمد مگر
مصلحت خاموشی اور اَمَنّا صدّقنا مرا

اپنے محور پر زمیں آئے تو لمحہ بھر سہی
دیر سے خالی پڑا ہے خاکہ دنیا مرا



تعاون بھی ملا فریاد و آہ و اشکباری کا
مگر یونہی کیا ہر مرحلہ طے بے قراری کا

قراں سے ذرا بھی روشنی اس پر نہیں پڑتی
کہ دل مشتاق کب سے تھا فضائے سوگاری کا

ترے شیدائی پھر بھی جاں بحق ہونے کو حاضر ہیں
کوئی جذبہ نہیں اس بار گرچہ جاں نثاری کا

مگر وہ سخت جاں قطرہ بھی آنکھوں میں نہیں آتا
چپلن زندہ رکھا جائے تو کیسے غم گساری کا

سمجھ میں کچھ نہیں آتا مگر دلچسپی قائم ہے
یہی تو کارنامہ ہے اس البیلے مسداری کا



انگنت صدیوں پہ پھیلی ہوئی تیری دنیا
اور میں تجھ سے بس اک لمحہ طلب کرتا ہوں

تو ذرا میرے مطابق تو بنادے مجھ کو
دیکھنا کیسے میں تیرا کہا سب کرتا ہوں

خود بخود ہوتی چلی جاتی ہے یہ عمر بسر
کس طرح کس لیے، کیوں، تبصرہ کب کرتا ہوں

نہ کسی نس میں تناؤ ہے نہ خوں کھولتا ہے
جیسا کہتے ہیں سبھی ویسا ہی اب کرتا ہوں



توجہ دیتے نہیں ہاتھوں کی لکٹیروں پر
کہ اک بزرگ کا سایہ ہے ہم فقیروں پر

وہی بزرگ بتاتے ہیں روزِ آخرِ شب
کوئی پکارتا ہے ہم کو ان جزیروں پر

انہیں جزیروں پہ جا کے پڑھا تھا اسم کوئی
وہ اسم نور سا چھایا رہا ضمیروں پر

ضمیر جاگا تو ہم پر کھلا کہ وقتِ عزیز
طرح طرح سے رہا مہرباں اسیروں پر

کہاں نصیب اسیروں کو یہ اسیری بھی
یہ لطفِ خاص ہے حضرت کا ہم فقیروں پر



مرے سخن پہ اک احسان اب کے سال تو کر
تو مجھ کو درد کی دولت سے مالا مال تو کر

دلِ عزیز کو تیرے سپرد کر دیا ہے
تو دل لگ کے ذرا اس کی دیکھ بھال تو کر

کئی دنوں سے میں اک بات کہنا چاہتا ہوں
تو لبِ ہلا تو سہی ہاں کوئی سوال تو کر

میں اجنبی کی طرح تیرے پاس سے گذرا
یہ کیا تعلق خاطر ہے کچھ خیال تو کر

میں چاہ کر بھی ترے ساتھ رہ نہیں پاؤں
تو میرے غم، مری مجبوری پر ملال تو کر



رزقِ برحق میرے حصے میں نہیں آیا ابھی
تیرے ہونے پر مجھے پھر سے یقیں آیا ابھی

میں تو کب سے خانہ دل کو سجائے بیٹھا تھا
اب یہ اس کی کم نصیبی گر میکس آیا ابھی

یہ مزہ دشتِ تمنا کی مسافت میں ملا
آسماں لگتا تھا بس سوئے زمیں آیا ابھی

جو ستارہ مٹھی میں محسوس ہوتا تھا مجھے
واقعہ یوں ہے کہ وہ میرے قریں آیا ابھی



تو کیا تڑپ نہ تھی اب کے مرے پکارے میں
وگر نہ وہ تو چلا آتا تھا اشارے میں

وہ بات اس کو بتانا بہت ضروری تھی
وہ بات کس لیے کہتا میں استعارے میں

مدمام ہجبر کدے میں وہ یاد روشن ہے
کہاں ہے اے دلِ ناکام تو خسارے میں

مرے علاوہ سبھی لوگ اب یہ مانتے ہیں
غلط نہیں تھی مری رائے اس کے بارے میں

فقیہ ہے یہ کرامت کسی نے دیکھی نہیں
گذر بسر ہی کیا کرتا ہے گزارے میں



اگر لگا کہ میں یہ جنگ ہار سکتا ہوں
تو دل ہی کیا مری جاں، جاں بھی وار سکتا ہوں

تو حوصلہ تو ذرا رکھ کہ وقت آنے پر
ترے لیے میں خدا کو پکار سکتا ہوں

مرے یقین و جنوں کا تو امتحاں مت لے
میں پانیوں پہ ترا نام ابھار سکتا ہوں

جن آسمانوں کے تو خواب بنتی ہے ان کی
میں اس زمین پہ تعبیر اتار سکتا ہوں

ابھی گرفت سے باہر یہ کائنات نہیں
بگاڑ سکتا ہوں اس کو سنوار سکتا ہوں



بھیڑ تھی لیکن بنام دوستاں کوئی نہیں تھا
مہرباں سچ کہہ رہا ہوں مہرباں کوئی نہیں تھا

آج میں جس قریہ سرسبز کے اوپر کھڑا ہوں
ابتدا میں اس کے سر پر آسماں کوئی نہیں تھا

میرے حصے ہی میں لکھا تھا سماعت کو ترنا
ورنہ اطراف و جوانب بے زباں کوئی نہیں تھا

صبح کیسے کی ہے فرصت سے بتاؤں گا کسی دن
ہاں یقیناً جانو شب رفتہ یہاں کوئی نہیں تھا

دوڑتا پھرتا تھا کیا رگ رگ میں میری آگ سا پھر
فسد کھلوائی تو خوں جیسا نشان کوئی نہیں تھا

سخت حیرت ہے کہ کس رنج مسلسل میں رہا میں
کاروبارِ زیست میں سود و زیاں کوئی نہیں تھا



ہمارے ذہن میں یہ بات بھی نہیں آئی
کہ تیری یاد ہمیں رات بھی نہیں آئی

بچھڑتے وقت جو گرے وہ کیسے بادل تھے
یہ کیسا ہجر کہ برسات بھی نہیں آئی

تجھے نہ پاسکے ہم اس کا اک سبب یہ ہے
پلٹ کے گردشِ حالات بھی نہیں آئی

ہوا یوں ہاتھ سے بازی نکل گئی اک روز
ہمارے حصے میں پھر مات بھی نہیں آئی

الجھ کے رہ گئے کیا ہم بھی کارِ دنیا میں
کہ نوبتِ سفرِ ذات بھی نہیں آئی



وقت کے آگے سر تسلیم خم کرتے چلو
اک مساثا ہے فقط شادی و غم کرتے چلو

کیا خبر یہ آخری سوغاتِ دردِ عشق ہو
جس قدر بھی ہو سکے اب آنکھ نم کرتے چلو

زخمِ دل سرسبز رکھنا ہے تو اس کو گاہ گاہ
یادِ یارِ مہرباں سے تازہ دم کرتے چلو

اپنے چہرے کو جھلنے دو دھکتی دھوپ میں
ہاں! خیال و خواب کا ہر سایہ کم کرتے چلو

جیتوئے دشت میں ضائع نہ ہو جائے جنوں
ہو سکے تو شہر ہی میں اب کے رم کرتے چلو



جو اس برس نہیں اگلے برس میں دے دے تو
یہ کائنات مری دسترس میں دے دے تو

سکون چاہتا ہوں میں سکون چاہتا ہوں
کھلی فضا میں نہیں تو قفس میں دے دے تو

یہ کیا کہ حرفِ دعا پر بھی برفِ جہنم لگی
کوئی سلگتا شرارہ نفس میں دے دے تو

میں دونوں کام میں مشاق ہوں مگر مجھ کو
ذرا تمیز تو عشق و ہوس میں دے دے تو

اس ایک شخص کے ساتھ ایک عمر رہ لوں میں
بس ایک لمحہ مجھے میرے بس میں دے دے تو



پھر اس کے بعد نہ تھا زیرِ پا زمیں ہونا
مگر ضرر سے بچاتا رہا یقیں ہونا

اجڑنے دیتا ہے مجھ کو نہ بسنے دیتا ہے
یہ تیری یاد کا مجھ میں پنہ گزریں ہونا

تمام رونق ہستی مٹا گیا یک لخت
اس اک ستارۂ منخوس کا قریں ہونا

وہ دیکھتا ہوں جو واقع ابھی ہوا بھی نہیں
کوئی عذاب ہے یہ چشمِ دوریں ہونا

ابھی خلاؤں کا لمبا سفر بھی ہے درپیش
مجھے زمیں سے بہت منسلک نہیں ہونا



قیس بے خانہ کی منزل آئے
سایہ ساجب پس محفل آئے

ہاں وہی صورت مہتابی پھر
نصف شب بعد یہ محفل آئے

اس پہ تقسیم تو کیجے خود کو
کیا ضروری ہے کہ حاصل آئے

گردش وقت بھی کیا مرہم ہے
خود بخود زخم کئی سل آئے

راستہ دیکھ رہا ہے اپنا
کاش کہ گوشہ نشین مل آئے



اس سوچ میں ہی مرحلہ شب گذر گیا
در وا کیا تو کس لیے سایہ بکھر گیا

اک لمحہ اپنے ساتھ رہا میں زمانے بعد
بے نام سا سکوت تھا جب رات گھر گیا

رکھتا تھا حکم موت کا جو راہِ وصل میں
وہ لمحہ فراق مرے ڈر سے مر گیا

سب رونقیں بضد تھیں جہاں گھر بنانے کو
وہ قریہ وجود خلاؤں سے بھر گیا

میں باندھ ہی رہا تھا غزل میں اسے ابھی
وہ زینہ خیال سے نیچے اتر گیا



مشغلہ یہ بھی بہت اچھا ہے لیکن وقت پر
ہم بھی فرمائیں گے یارو عشق اک دن وقت پر

ہاں کہاں سے لائیں بام و در کی باتوں کا جواب
ہاں کریں گے کیا پہنچ کر گھر ترے بن وقت پر

کاش ہم اس درد سے یک لخت پا جاتے نجات
کاش دس لیتی ہمیں یہ حشر ناگن وقت پر

تو زمیں کو آسماں کرنے کی کوشش ٹھیک ہے
سنتے ہیں ہر چیز ہو جاتی ہے ممکن وقت پر



یاد کی بستی کا یوں تو ہر مکاں خالی ہوا
بس گیا تھا جو خلا سا وہ کہاں خالی ہوا

رات بھراک آگ سی جلتی رہی تھی آنکھ میں
اور پھر دن بھر مسلسل اک دھواں خالی ہوا

خود بخود اک دشت نے تشکیل پائی اور پھر
لمحہ بھر میں ایک شہر بیکراں خالی ہوا

آج جب اس لطف سائے کی ضرورت ہے ہمیں
بے نصیبی یہ کہ دستِ مہرباں خالی ہوا

رفتہ رفتہ بھر گیا ہر سود سے اپنا بھی جی
رفتہ رفتہ دل سے احساسِ زیاں خالی ہوا

آج سے ہم بھی اکیلے ہو گئے اس بھیر میں
دھیان میں تھا جو بھرا سا آسماں خالی ہوا



میں کچھ سمجھا نہیں کیا تھا مقابل
مگر کچھ تھا تماشا سا مقابل

میں اپنی فتح پر نازاں نہیں ہوں
پہ سنتا ہوں کہ تھی دنیا مقابل

تعاقب میں ہے یا پھر منظر ہے
کوئی چہرہ پس چہرہ مقابل

ہوس ہے منظروں کو دیکھنے کی
اور اس پر چشم آوارہ مقابل

عجب سازش چلی ہے روشنی نے
کہ خود پیچھے ہے اور سایہ مقابل



رگوں میں آج بھی یہ خون سا رواں ہے کیا
تو دردِ عشق حقیقت میں جاوداں ہے کیا

ہوا میں کھیل رہا ہے جو ابر کی صورت
کسی مکان سے اٹھتا ہوا دھواں ہے کیا

یہ ہم جو چھوتے ہیں ہر روز چاند تاروں کو
ہمارے پاؤں تلے کوئی آسماں ہے کیا

پرند کس لیے کرتے ہیں آشیاں سے کوچ
انہیں بھی حاجتِ یک گوشہ اماں ہے کیا



(ایمن سرمدی کے لیے)

گم سم گم سم لگتے نہیں تم ہم کو اچھے اللہ میاں
بولو بولو کچھ تو بولو پھول سے پیارے اللہ میاں

رات ملے چندا ماما سے اور پریوں کے دیس گئے
اڈن کھولے میں دیکھے تھے بغل میں بیٹھے اللہ میاں

اس دن جب بارش میں ہماری ناؤ ڈوبی پانی میں
صحن میں بیٹھے ساتھ ہمارے روئے جیسے اللہ میاں

دودھ جلیبی کیوں نہیں لاتے کہاں ہے مٹی کا ہاتھی
ہم نہیں بولتے ہم نہیں بولتے کالے کلوٹے اللہ میاں

کہاں اندھیرے میں جاتے ہو باہر بھوت آجائے گا
دیکھو چپکے سے سوجاؤ ساتھ ہمارے اللہ میاں

ممو عود

میں شکر گزار ہوں۔۔۔

- زیر شاداب کا جنھوں نے اس مجموعے کو پر خلوص تنقیدی نظر سے دیکھا اور مرتب کیا۔
 - امیر حمزہ ثاقب کا جنھوں نے تمام مسودے کو جمع کیا۔ جن کی محبت اور محنت کے باعث اس مجموعے کا موجودہ شکل میں آنا ممکن ہوا۔
 - سالم سلیم کا جنھوں نے نہ صرف اس مجموعے پر بلکہ دیگر مواقع پر بھی وقفہ فوقتاً میری شاعری پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔
 - مہتاب حیدر نقوی، عالم خورشید اور شارق کیفی کا جنھوں نے اس مجموعے کی اشاعت پر اصرار کیا۔
 - ملک احسان احمد، امتیاز احمد، عبدالمنان صمدی، تصنیف حیدر، راغب اختر، صابر، سراج الجمالی، عارف ایوبی، ابھیشیک شکلا اور امیر امام کا جن سے ارتباط کے سبب بیرون ملک رہنے کے باوجود اردو دنیا سے دوری کے احساس سے محفوظ رہا۔
 - مرزا صوبی بیگ اور شمیم اقبال کا جنھوں نے اس مجموعے کی کمپیوگرانی اور تزئین کاری کی زحمت اٹھائی۔
 - محمد جعفر اور فیضان معروفی کا جنھوں نے اس مجموعے کے مسودے کو دیکھنے میں میری مدد کی۔
 - دہلیز پبلی کیشنز کے مالک زمر د مغل کا جنھوں نے اس مجموعے کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔
- اور
- اپنی بیوی شائستہ سرمدی کا جنھوں نے اس مجموعے کی اشاعت میں دلچسپی لی اور اس مرحلے کو مزید خوشگوار بنایا۔

شہرام سرمدی